مقالہ نمبر ۹

تذکرہ

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب بجنوری

صفحہ	عنوان	نمبر شمار

مقالہ نمبر ۹
تذکرہ حکیم الامت رحمہ
مولانا مفتی عزیز الرحمٰن بجنوری۔

تذکرہ حکیم الامت

نام ونسب آپ کا تاریخی نام 'کرم عظیم' اور دادھیال کا مقرر کردہ نام عبدالغنی نانہال ۱۲۸۰ھ کی طرف سے حافظ غلام مرتضیٰ صاحب مجذوب کا تجویز کردہ نام "اشرف علی" ہے۔ آپ مجذوب ممدوح کی برکت دعا سے پیدا ہوئے چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں:

یہ جو میں کبھی اکھڑی اکھڑی باتیں کرنے لگتا ہوں ان ہی مجذوب صاحب کی روحانی توجہ کا اثر ہے۔ جن کی دعا سے میں پیدا ہوا ہوں کیونکہ طبیعت مجذوبوں کی طرح آزاد ہے۔ الجھی ہوئی باتوں کی متحمل نہیں۔

علاوہ ازیں شرافت نسبی کے اعتبار سے ماں کی طرف سے آپ سیّد اور علوی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس طرح آپ کا سلسلۂ نسب چند واسطوں سے حضرت میاں جی نور محمد صاحب جھنجھانویؒ کے نسب سے مل جاتا ہے۔ باپ کی طرف سے آپ فاروقی النسل شیخ ہیں۔ چنانچہ مؤلف سوانح کی تحقیق ہے۔

"شیوخ تھانہ بھون حضرت شیخ مجدد الف ثانی حضرت شیخ تھانیسری وحضرت شیخ فریدالدین گنج شکر۔ یہ سب سلطان شہاب ملقب بہ فرخ شاہ کابلی کی اولاد سے ہیں۔ الخ

حضرت والا کیا بلحاظ ظاہر اور کیا بلحاظ باطن شاہی خاندان سے نسبت رکھتے ہیں[1] الخ

---

[1] اشرف السوانح ص۱۳ ج ۱

سونے پر سہاگہ یہ کہ آپ ایک بہت بڑے رئیس شیخ عبدالحق صاحب تھانویؒ کے گھر میں پیدا ہوئے تاریخ پیدائش ۵ ربیع الثانی ۱۲۸۰ھ ہے چھوٹے بھائی کا نام اکبر علی ہے۔ منشی اکبر علی صاحب عہد حکومت برطانیہ میں بریلی شہر میں مشاہرہ پانچ صدروپیہ ماہوار ملازم تھے۔

غرضیکہ آپ کی پرورش نہایت ہی ناز و نعم میں ہوئی۔ حضرت تھانویؒ ان تمام وجوہات سے بچپن میں ایک مزاج رکھتے تھے جو مشائخ دیوبند میں سے کسی کا نہیں تھا۔ چنانچہ مؤلف سوانح حیات تحریر فرماتے ہیں:

"حضرت والا بچپن میں کسی کا ننگا پیٹ نہیں دیکھ سکتے تھے۔ دیکھتے ہی بس فوراً قے ہوجاتی تھی یہ حضرت والا نے اپنے خاندان کے بزرگوں سے سُنا ہے۔ چونکہ لڑکوں کو یہ معلوم تھا اس لیے حضرت والا کو تنگ کیا کرتے تھے۔ اور پیٹ کھول کھول کر دکھاتے اور حضرت والا قے کرتے کرتے پریشان ہوجاتے۔ الخ کسی کا جھوٹا کھانا یا پانی استعمال نہیں فرما سکتے گھن آتی تھی یہاں تک کہ کبھی اپنے بزرگوں کے سامنے کا بچا ہوا کھانا پانی تبرکاً استعمال نہیں کرسکے۔ الخ (اشرف السوانح صـ ۲۱-۲۲ ج-۱)

غرضیکہ خاندانی اثرات و اسباب اور ماحول کی وجہ سے قدرت نے آپ کو عجیب غریب مزاج عنایت فرمایا تھا جس کی وجہ سے آپ ایک مخصوص مزاج کے مالک رہے جس کا تذکرہ اوپر آچکا ہے۔

تعلیم وتربیّت

یہ بھی قدرتی امر تھا کہ آپ کے والد ماجد نے آپ کو عربی تعلیم کے لیے اور چھوٹے بھائی منشی اکبر علی صاحب

کو انگریزی تعلیم کے لیے منتخب کیا۔ آپ نے قرآن شریف حافظ حسین علی صاحب سے حفظ کیا تھا۔ اور چند پارے آخون جی صاحب سے پڑھے۔ فارسی میرٹھ کے مختلف اساتذہ سے پڑھی۔ اور متوسطات مولانا فتح محمد صاحب تھانویؒ اور انتہائی کتابیں اپنے ماموں امجد علی صاحب اور بعض کتابیں دیوبند میں مولانا منفعت علی صاحب سے پڑھیں۔ زمانۂ طالب علمی میں آپ کو فارسی لکھنے اور بولنے کی کافی مہارت ہو گئی تھی۔ چنانچہ اس زمانہ میں مثنوی زیروبم آپ نے تصنیف فرمائی جس سے آپ کی مہارت کا اندازہ ہوتا ہے۔

عربی کی ابتدائی کتابیں مولانا فتح محمد صاحب سے تھانہ بھون رہ کر پڑھیں۔ اور آخری ذیقعدہ ۱۲۹۵ھ میں آپ بغرض تحصیل و تکمیل علوم دینیہ، دیوبند تشریف لے گئے۔ اور ۱۳۰۱ھ میں فارغ التحصیل ہوئے۔ آپ کے مربی و شفیق اساتذہ میں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ، شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحبؒ، مُلّا محمود صاحب اور مولانا سیّد احمد صاحب وغیرہ رحمہم اللہ تعالیٰ ہیں۔

قرأت کی مشق آپ نے حضرت قاری محمد عبداللہ صاحب مہاجر مکی کے سامنے مکہ معظمہ رہ کر فرمائی۔ آپ کی دستار بندی حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز کے دستِ مبارک سے ۱۳۰۰ھ میں ہوئی۔

سلسلۂ تدریس

دار العلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد آپ آخر صفر ۱۳۰۱ھ میں باجازت والد ماجد اور اساتذہ کانپور تشریف لے گئے۔ اور مدرسہ فیض عام میں پڑھانا شروع کر دیا۔ کچھ مدت کے بعد آپ میں اور اراکین مدرسہ میں اختلاف ہوا۔ وجہ اختلاف یہ تھی کہ

اراکین چاہتے تھے کہ آپ وعظ کر کے چندہ بھی وصول کریں۔ لیکن آپ نے اس کو منظور نہ کیا۔ اور مدرسہ سے استعفیٰ دے دیا۔ کانپور کے دیگر حضرات نے جب دیکھا کہ ایک قابل عالم ہاتھ سے جاتا ہے تو باصرار آپ کو روکا اور ایک مدرسہ جامع العلوم قائم کیا۔ اور آپ کو پچیس روپلے مشاہرہ پر مدرسہ میں ملازم رکھ لیا۔ غرض کہ آپ یہاں چودہ سال تک مقیم رہے اور وعظ، درس و تدریس، افتار، کی خدمات انجام دیتے رہے۔ کانپور کے چودہ سالہ قیام کی وجہ سے آپ کو کافی شہرت حاصل ہوئی۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں۔

> میری اتنی جو شہرت ہوئی تو وہ کانپور والوں کی بدولت ہوئی ورنہ میں واقعی اس درجہ کا شخص ہرگز نہ تھا[1]

حقیقت یہ ہے کہ آپ نے کانپور میں رہ کر دین کی اس قدر خدمت کی کہ غیر اپنے ہو گئے۔ اور آپ سے محبت کرنے لگے۔ اور اس کے گرد و نواح میں بدعت کا قلع قمع اور سنّت کا اجرا، آپ ہی کے دم قدم سے ہوا۔ غرض کہ ۱۴ سال تک آپ نے کانپور میں درس و تدریس کی خدمات انجام دی۔ اور ۱۳۱۵ھ میں آپ کانپور چھوڑ کر وطن یعنی تھانہ بھون تشریف لائے۔ اور حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کی خانقاہ کو آباد کیا۔

بیعت اور سلوک

حضرت مولانا قدس سرہٗ کی پوری زندگی پر نظر ڈالنے کے بعد معلوم ہوتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو دین کے لیے پیدا کیا تھا۔ اس لیے کہ پیدا ہونے سے قبل ہی اس قسم کی چیزوں کا ظہور ہوا۔ کہ جس سے صاف کہا جا سکتا تھا۔ کہ "اشرف علی" کوئی غیر معمولی بزرگ ہوگا۔

---

[1] اشرف السوانح صـ۱۲۴ ج ۱

اسے دیکھ طفلی میں کہتی تھی دایہ
یہ بچہ طرحدار پیدا ہوا ہے

تولد ہونے کے بعد عربی تعلیم کے لیے آپ کا انتخاب بھی ایک منجانب اللہ امر تھا۔ ورنہ عقل کا تقاضہ تو یہ تھا کہ آپ کو دنیاوی تعلیم دی جاتی۔ اور آپ کے برادر خورد کو عربی تعلیم۔ کیونکہ ماں باپ پہل کی اولاد کو عموماً اسی طرز پر چلانا پسند کرتے ہیں جس پر خود ہوتے ہیں۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کی پیشین گوئی "جہاں تم جاؤ گے تم ہی تم نظر آؤ گے" نے اصحاب باطن اور تجربہ کار حضرات کے قلوب میں حضرت مولانا قدس سرہٗ کے متعلق کہ یہ طالب علم ہونہار ہے۔ یقین کا درجہ دے دیا تھا۔

غرض کہ باطنی اشارات کے ماتحت فطرۃً اسی لائحہ عمل کو اختیار کیا۔ اور اسی راستے پر گامزن ہوئے۔ جس کے لیے آپ کو پیدا کیا گیا تھا۔ علوم ظاہر سے فارغ ہونے کے بعد آپ کے دل میں تزکیہ باطن کی تڑپ پیدا ہوئی۔

ابتدا میں آپ کا قلبی میلان قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کی طرف تھا۔ چنانچہ مؤلف سوانح فرماتے ہیں:۔

حضرت والا نے طالب علمی کے زمانہ میں اول آپ (حضرت گنگوہیؒ) ہی سے مدرسہ دیوبند میں بیعت ہونے کی درخواست کی تھی۔ لیکن مولانا (حضرت گنگوہیؒ) نے طالب علمی کے زمانہ میں بیعت کرنے کو خلاف مصلحت اور خارج تحصیل علوم دینیہ خیال فرما کر عذر فرما دیا[1]

---

[1] اشرف السوانح صہ ۱۳۲ ج ۱

ایک بار حضرت مولانا گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز کسی ضرورت سے مدرسہ دیوبند تشریف لائے۔ حضرت والا (مولانا تھانویؒ) زیارت کرتے ہی غایت اشتیاق میں بغرض مصافحہ دوڑے، تو اینٹوں کی وجہ سے جو اس وقت وہاں نودرہ کی تعمیر کے لیے پڑی ہوئی تھیں۔ حضرت والا (مولانا تھانوی) کا پاؤں بے اختیار پھسلا۔ اور زمین پر گرنے ہی کو تھے کہ حضرت مولانا (مولانا گنگوہیؒ) نے فوراً ہاتھ پکڑ کر سنبھال لیا۔ حضرت والا (مولانا تھانوی) کو حضرت مولانا (مولانا گنگوہیؒ) کی زیارت ہوتے ہی اس قدر کشش اور عقیدت ہوئی کہ بیعت کی درخواست کی۔ مولانا حضرت گنگوہیؒ) نے اس بناء پر کہ بزمانہ طالب علمی شغل باطن مخل تحصیل علم ہوگا۔ انکار فرمادیا۔ الخ (اشرف السوانح ص۱۹۶)

هٰـكذا فی یادیاراں حضرت والا کے ایک اور ہم سبق نے بھی اسی دوران میں حضرت مولانا گنگوہیؒ سے بیعت کی درخواست کی تو ان سے انکار نہیں فرمایا اور ان کو بیعت کر لیا۔ جس سے حضرت والا کو اور بھی حسرت ہوئی۔ الخ [1]

بہر حال ابتداء میں حضرت تھانویؒ حضرت گنگوہیؒ سے بیعت ہونا چاہتے تھے اور اس قدر اشتیاق تھا کہ آپ نے حضرت گنگوہیؒ (جبکہ وہ تیسرے حج کے لیے مکہ معظمہ تشریف لے جا رہے تھے) کے بدست حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں ایک خط بھیجا کہ آپ مولانا گنگوہیؒ سے سفارش فرمادیں کہ وہ مجھے بیعت کر لیں لیکن اس

---

[1] اشرف السوانح ص۱۹۷ ج ۱

کے بعد آپ اپنے والد ماجد قدس سرہٗ کے ہمراہ حج کے لیئے تشریف لے گئے اور مکہ معظمہ پہنچ کر حضرت شیخ العرب والعجم حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہٗ کے خدام میں داخل ہو گئے اور شرف بیعت سے مشرف ہوئے۔ اور چونکہ ؎

مردِ حق کی گویا پیشانی کا نور
کب چھپا رہتا ہے پیش ذی شعور

حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ نے آپ کو بیعت فرما لیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ حضرت گنگوہیؒ نے کسی اشارۂ باطنی کی وجہ سے اس درِ ناشفتہ کو رشتہ بیعت میں منسلک نہیں کیا تھا۔ ؎

یہ کیفیت اسے ملتی ہے جس کے ہے مقدر میں
مئے الفت نہ خم میں ہے نہ شیشہ میں نہ ساغر میں

بہر حال حضرت حکیم الامتؒ حضرت حاجی صاحبؒ کے میکدہ میں داخل ہو کر نچوڑ میخانہ نکلے۔

چونکہ آپ اپنے والد صاحب کے ہمراہ تھے۔ اس لیے مستقل اقامت کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ العزیز نے فرمایا بھی کہ کم از کم چھ مہینے قیام کرو۔ لیکن قیام کرنا ممکن نہ ہوا۔ اور آپ واپس ہندوستان تشریف لے آئے۔ اور کانپور پہنچ کر درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔

سلسلۂ بیعت و خانقاہ

حضرت حاجی صاحبؒ اور حضرت گنگوہیؒ کو آپ سے محبت تھی۔ ہر دو حضرات آپ کی بہت زیادہ رعایت فرماتے۔ اور شفقت اور محبت کا برتاؤ بھی کرتے تھے۔ حضرت گنگوہیؒ

تو پیر بھائی ہونے کی وجہ سے احترام بھی کرتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ جب آپ گنگوہ تشریف لے گئے تو حضرت گنگوہیؒ چارپائی سے نیچے اُتر کر برابر ہی میں بیٹھ گئے۔ بعض لوگوں نے عرض بھی کیا۔ حضرت وہ تو اپنے آپ کو حضرت کا ایک مرید سمجھتے ہیں۔ تو حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا۔ تم تو اندھے ہو گئے ہو۔ میں تو اندھا نہیں ہوں۔ اسی طرح حضرت حاجی صاحب سے اگر کوئی پوچھتا تو فرماتے یہ میرا لوپتا ہے۔ غرض کہ ہر دو حضرات سے خصوصی اور گہرے تعلقات تھے۔

۱۳۱۰ھ میں آپ پھر دوبارہ مکہ معظمہ تشریف لے گئے اور تقریباً چھ مہینے آپ نے قیام کیا۔ اور ذکر و فکر میں مشغول رہے۔ اس قیام میں حضرت حاجی صاحبؒ نے مخصوص توجہات سے نوازا۔ اور غالباً اسی قیام میں آپ کو اجازت بیعت بھی مرحمت فرمائی۔ مؤلف سوانح نے اس سلسلہ میں کوئی خاص تصریح نہیں کی اور نہ ہی کسی تاریخ کی تعین ہی کی ہے۔ ہم نے ۱۳۱۰ھ صرف قرائن کی وجہ سے لکھ دیا ہے بہر حال آپ نے حلقۂ توجہ اور سلسلہ بیعت ۱۳۱۰ھ کے بعد کانپور سے شروع کر دیا تھا۔ اور تھانہ بھون پہنچنے کے بعد تو مستقل اصلاحِ خلق کا کام شروع کر دیا۔ اور خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون کو آباد کیا۔

اصول وضوابط

اس میں شک نہیں کہ حضرت تھانویؒ نہایت لطیف مزاج تھے متقدین میں سے مزاج کے اعتبار سے آپ کو مرزا مظہر جانِ جاناں ثانی کہا جا سکتا ہے۔ آپ —— مترتب المزاج اور اصول وضابطہ کے پابند تھے۔ اور حقیقت یہ کہ اگر آپ مترتب المزاجی اور اصول وضوابط سے کام نہ لیتے تو تصنیف وتالیف کا کام ہرگز نہ کر پا سکتے تھے۔

ہم اوپر عرض کر آئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو دین کی خدمت کے لیے پیدا کیا۔ کیونکہ ایک خاص نوعیّت کی خدمت آپ سے لینی تھی۔ اس وجہ سے شروع سے ایسے اسباب مہیّا کر دیئے تھے اور مزاج بھی ایسا ہی مرحمت فرمایا اب ہم آپ کے اصُول وضوابط کو مختصراً ذکر کرتے ہیں۔

شرائط داخلہ خانقاہ ذیل میں اشرف السوانح سے شرائط داخلہ کا نقشہ پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ فارم شرائط داخلہ خانقاہ امدادیہ اشرفیہ کے نو واردین کو دے دیا جاتا تھا کہ جس کی خانہ پُری واردین کو اپنے آپ کرنی پڑتی تھی۔ اور اگر کوئی پڑھا ہوا نہ ہوتا تو دوسروں سے بھروا کر داخل کرتا تھا۔

نقشہ شرائط داخلہ خانقاہ

۱۔ نام۔؟

۲۔ وطن اصلی۔؟

۳۔ اس وقت کس مقام سے آنا ہوا اور اس مقام میں کتنا قیام رہا۔

۴۔ شغل ووجہ معاش۔؟

۵۔ موروثی زمین تو آپ کے پاس نہیں۔؟

۶۔ علمی استعداد۔ اردو یا عربی یا انگریزی میں کس قدر ہے۔؟

۷۔ اصلی مقصد آنے سے کیا ہے محض ملاقات یا کچھ کہنا اور لکھ کر دینا یا زبانی اور مجمع میں یا تنہائی میں۔

۸۔ کسی سے بیعت ہیں یا نہیں اور کس سے۔؟

۹۔ اگر مجھ سے بیعت ہیں تو بیعت کو کتنا زمانہ ہوا۔ اور تعلیم کس کے متعلق ہے؟

۱۰۔ میرے مواعظ اور رسائل کیا کیا دیکھے ہیں۔؟

۱۱۔ اگر مجھ سے کچھ خط و کتابت ہوئی ہے تو وہ پاس ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو پھر دکھلایا جائے۔؟

۱۲۔ کتنا قیام ہوگا۔؟

۱۳۔ کہاں قیام ہوگا۔؟

۱۴۔ خانقاہ میں اوّل بار آنا ہوا ہے یا پہلے بھی آئے ہیں۔ اگر پہلے بھی آئے ہیں تو کتنا قیام ہوا تھا۔؟

۱۵۔ یہاں کے انتظام طعام کی آپ کو خبر ہے یا نہیں[۱]۔؟

۱۶۔ باہر والا بڑا اعلان قلمی دیکھ لیا یا نہیں[۲]۔ (ماخوذ از اشرف السوانح ص۲۴۲ ج ۲)

---

[۱] نو واردین کے لیے طعام کا انتظام یہ تھا کہ ایک دکان مقرر کر دی گئی تھی۔ اور کھانوں کا نرخ مقرر کر دیا گیا تھا کہ واردین کو جس کھانے کی ضرورت ہو اس بھاؤ سے ملے گا۔

[۲] یہ نقشہ بھی اسی نقشہ سے ملحق پیش کیا جارہا ہے۔

(بندہ غفرلہٗ)

بڑا اعلان انضباطِ اوقات

۱۔ صبح سے بارہ بجے تک مجھ کو متفرق ایسے کام رہتے ہیں جو تنہائی میں ہو سکتے ہیں۔ اس وقت کسی سے ملنے یا بات چیت کرنے میں تکلیف بھی ہے اور حرج بھی۔

۲۔ البتہ اوپر کے نمبر سے تین شخص مستثنیٰ ہیں۔ ایک وہ شخص جو تازہ آیا ہو اور صرف ملاقات کا مصافحہ کرنا چاہتا ہو، دوسرا وہ جو جا رہا ہے اور صرف رخصت کا مصافحہ کرنا چاہتا ہے۔ تیسرا وہ شخص جس کو ایسی حاجت ہو کہ اس میں مہلت نہیں ہو سکتی۔ مثلاً دردِ زہ وغیرہ کا تعویذ لینا ہو یا فوری ضروریات کا کوئی مسئلہ پوچھنا ہو۔ جس میں تاخیر نہ ہو سکے۔ مگر ان تینوں شخصوں کو چاہیے۔ کہ آتے ہی کہہ دیں کہ ہمارے اس وقت آنے کی یہ وجہ ہے تاکہ معلوم نہ ہونے سے پریشانی نہ ہو۔

۳۔ پھر بارہ بجے سے نمازِ ظہر سے فارغ ہو کر اپنی مجلس میں بیٹھنے تک میرے قیلولہ اور نماز کا وقت ہے اس میں ملاقات سے اور سب خدمات سے معافی چاہتا ہوں۔

۴۔ پھر جب ظہر پڑھ کر اپنی مجلس میں حاضر ہو جاؤں اس وقت سے عصر کی اذان ہونے تک عام اجازت ہے۔ آنے کی بیٹھنے کی ہر قسم کی بات چیت کی۔ تعویذ وغیرہ مانگنے کی۔ البتہ جمعہ کا دن تعویذ سے مستثنیٰ ہے۔

۵۔ پھر اذانِ عصر سے نماز سے فارغ ہونے کے لیے وہی قاعدہ ہے جو قیلولہ

کے وقت کا ہے جو ۳ میں مذکور ہے۔

۶۔ پھر عصر سے فارغ ہونے کے بعد سے عشاء سے فارغ ہونے تک کےلیے وہ قاعدہ ہے۔ جو صبح سے بارہ بجے تک کے وقت کا ہے جو نمبر ا میں مذکور ہے اور وہی لوگ یہاں بھی مستثنیٰ ہیں جو نمبر ۲ میں مذکور ہیں۔

۷۔ عشاء کے بعد تو معذوری ظاہر ہے باستثنا اضطرار شدید۔

۸۔ یہ قواعد تو ان صاحبوں کے لیے ہیں جو مجمع میں اپنا مقصود ظاہر فرما سکتے ہیں اور جو کسی کو کچھ پوشیدہ کہنا ہو۔ اس کے لیے یہ قاعدہ ہے کہ اگر تحریر کو کافی سمجھیں تو میری مجلس سے ملحق سہ دری کی دیوار میں ایک بکس لگا ہے۔ اس میں لکھ کر ڈال دیں۔ اور جس موقعہ پر جواب چاہتے ہوں اس کا پورا پتہ لکھ دیں۔ مثلاً فلاں نمبر کے حجرے میں یا مسجد کے ممبر پر ہمیشہ بعد نماز فجر ایسے پرچے نکالے جاتے ہیں۔ اس طریقہ سے تحریری جواب مل جائے گا۔ اور اگر وہ پوشیدہ بات زبانی ہی کہنا چاہیں تو ایسے ہی پرچہ کے ذریعہ تنہائی کا وقت پوچھ لیں میں جو وقت بتلاؤں اس وقت بات کرلیں اور اکثر بعد مغرب کا وقت بتلایا کرتا ہوں۔

۹۔ بعض مہمانوں کو میں خاص اجازت دے کر تنہائی کے وقت میں بٹھلا لیتا ہوں دوسرے حضرات اپنے کو ان پر قیاس نہ کریں۔ اور اسی طرح کسی کو کوئی خدمت پنکھا وغیرہ کی کرتا ہوا دیکھ کر دوسرے اس کی تقلید نہ کریں۔ جب تک خاص اجازت حاصل نہ کریں۔ جیسے جوتا اٹھانا یا لوٹا بھر کر رکھنا وغیرہ ذلک۔

۱۰۔ راستہ میں بھی کوئی صاحب میرے ساتھ نہ چلیں اور نہ گھر جاکر پکاریں۔

(ماخوذ از اشرف السوانح صد ۲۲۵ تا ۲۲۴ ج-۲-)

شرائط بیعت جب کوئی طالب حضرت والا سے رجوع کرتا ہے۔ خواہ تقریراً یا تحریراً، حاضراً یا غائباً تو بجز خاص اطمینانی مواقع کے ایک مطبوعہ پرچہ حوالہ فرما دیا جاتا ہے۔ جس میں بیعت بلا تعلیم اور تعلیم بلا بیعت کی شرائط جدا جدا درج ہیں جو ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

۱۔ قرآن شریف جتنا پڑھا ہے یا جتنا یاد ہے کسی صحیح پڑھنے والے سے صحیح یاد کرنا ہوگا۔

۲۔ بہشتی زیور کے سب حصے یا سات حصے اور بہشتی گوہر اور اصلاح الرسوم اور قصد السبیل کی تسہیل پڑھ کر یا سن کر پابندی کرنا ہوگی۔

۳۔ میرے چھپے ہوتے وعظ ہمیشہ پڑھنا یا سننا پڑیں گے۔

۴۔ ابتدائی تعلیم میرے کسی اجازت یافتہ (جس کو میں تجویز کر دوں یا طالب کی تجویز پر اجازت دے دوں) حاصل کرنا ہوگی۔ اور جب تک ۲۵ بار ان سے خط و کتابت نہ ہو چکے براہ راست مجھ سے تعلیم کی استدعا نہ کی جاتے۔

(ماخوذ از اشرف السوانح ص۱۲۹ ج۔۲)

حضرت تھانویؒ کے اصول و ضوابط اور آداب متفرقات کو اگر مفصل لکھا جائے تو اس کے لیے ایک مستقل رسالہ درکار ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسا کہ شاہی دربار کے آداب و قواعد و ضوابط ہوتے ہیں۔ ان تمام امور پر پابند ہونا اور پابندی کرانا یہ حضرت تھانویؒ ہی کا کام تھا۔ اگر کسی سے قواعد و ضوابط کے خلاف ہوا، تو پھر خیریت نہیں تھی۔ خانقاہ سے باہر نکال دیا جاتا تھا۔ اور اگر معافی بھی دے دی گئی۔ تب بھی سزا دی جاتی تھی۔ مثلاً:-

تدارک اکثر یہی ہوتا تھا کہ کسی قریب کے مقام پر جا کر وہاں سے پھر حاضری کی اجازت طلب کی جائے۔ اور بعض کے لیے صرف اس پر اکتفا فرمایا گیا کہ لکھ کر خانقاہ میں یہ اعلان آویزاں کر دیا جائے کہ مجھ سے فلاں اذیت و حرکت سرزد ہوئی ہے اور بعض کے لیے یہ تجویز فرمایا گیا کہ سب مقیمین خانقاہ سے فرداً فرداً اپنی غلطی کا اظہار کیا جائے۔ (اشرف السوانح صہ ۲۴۷ ج ۲)

اصول و ضوابط پر حتی الامکان پابند بنایا جاتا تھا۔ مثلاً کوئی ملاقات کی اجازت چاہتا تو مجال نہیں تھی کہ کوئی حرف بھی زبان سے نکال سکے۔ خاموش بیٹھا رہنا لازم تھا۔ (ملاحظہ فرمائیے صہ ۲۴۶ ج ۲)

مصافحہ کرنے والے نووارد کے لیے لازم تھا کہ مصافحہ کرتے ہی بتلائے کون ہے ہ کہاں سے آیا ہے ہ کیوں آیا ہے ہ وغیرہ وغیرہ۔

(ملاحظہ فرمائیے صہ ۲۶۲ ج ۲)

خط و کتابت کے لیے لازم تھا کہ ایک پرچے میں ایک ہی قسم کا سوال ہو جواب کے لیے خط ہونا، یا پھر لفافہ ہونا۔ اور لفافہ پر پتہ لکھا ہونا لازمی تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔

غرض کہ حضرت تھانویؒ نے بہت سے اصول و ضوابط وضع کیے جن پر خود بھی پابند رہے۔ اور دوسروں کو بھی پابند بنایا۔ اور یہ سب کچھ تربیت طالبین کے لیے ہوتا تھا۔

مواعظ

اللہ تعالیٰ کو جس آدمی سے جو کام لینا ہوتا ہے۔ شروع سے ہی اس کی طبیعت کو اسی کام کی طرف مائل کر دیتا ہے۔ چنانچہ حضرت تھانویؒ سے وعظ کے ذریعہ مسلمانوں کی اصلاح کرنی مقصود تھی۔ اس وجہ سے بچپن ہی سے آپ کی طبیعت کو اس کام کی طرف مائل کر دیا تھا لہٰذا آپ اگر کوئی کھیل بھی کھیلتے تو اس میں بھی یہی پہلو نمایاں ہوتا تھا۔ مؤلف سوانح لکھتے ہیں:

"وعظ کا بھی بچپن ہی سے شوق تھا۔ اور اس کی نقل بھی اتارا کرتے تھے۔ چنانچہ جب کبھی بازار کی طرف چھوٹے موٹے سودے کے لیے بھیجے جاتے تو جو مسجد راستے میں پڑتی اس میں چلے جاتے اور سیدھے منبر پر چڑھ جاتے اور کھڑے ہو کر کچھ خطبہ کی طرح پڑھ پڑھا کر چلے آتے۔ الخ

زمانہ طالب علمی میں بھی آپ نے اس شغل کو جاری رکھا۔

طالب علمی کے زمانے میں حضرت والا نے اپنے ہم سبق کی ایک جماعت قائم کر کے ہر شب جمعہ کو نوبت بنوبت وعظ گوئی کی مشق کا انتظام فرمایا تھا۔ الخ

آپ کے مواعظ نہایت پر مغز شخصیت آمیز۔ حکیمانہ ہوتے تھے۔ قرآن و حدیث اور دین کے مہمات مسائل کو چٹکی بجاتے ہی حل کر دیتے تھے۔ آپ نے وعظ پر کبھی معاوضہ نہیں لیا۔ اگر کوئی بطور ہدیہ کچھ پیش کرتا تب بھی بہت احتیاط کرتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ آپ کا کانپور میں وعظ ہوا۔ نواب صدیق حسن خاں صاحب کی صاحبزادی نے وعظ کہلایا تھا۔ بعد اختتام وعظ صاحبزادی نے کچھ بطور ہدیہ پیش کیا تو آپ نے منع کر دیا۔ عرض کیا گیا کہ حضرت! یہ تو ہدیہ ہے۔ ارشاد فرمایا

صورت معاوضہ کی پیدا ہو گئی ہے۔ دیکھنے والوں کو یہی شبہ ہو گا۔

آپ کے مواعظ میں تمثیلات، حکایات اور اشعار بھی موقع بموقع ہوتے ہیں کہ جن سے آپ حکیمانہ فوائد و نصائح بھی اخذ کرتے چلتے ہیں ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض مرتبہ قبیح سے قبیح حکایات سے عجیب و غریب فوائد اخذ کرتے ہیں۔ وعظ میں تصنع و بناوٹ نام کو نہیں ہوتی۔ ایک مرتبہ ایک سننے والے نے کہا وعظ تو بہت اچھا تھا مگر آواز اچھی نہیں تھی۔ چنانچہ آپ نے دوسرے موقعہ پر ارشاد فرمایا:۔

"میں ڈوم نہیں، ڈوم کی اولاد نہیں، ڈوم کا شاگرد نہیں"۔

غرض کہ آپ کے حکیمانہ مواعظ حسنہ سے مخلوقِ خدا کو بہت فائدہ پہنچا۔ قوم کی بہت زیادہ اصلاح ہوئی۔ آج بھی آپ کے سینکڑوں مواعظ مطبوعہ موجود ہیں جن سے وہی فائدہ ہوتا ہے جو پہلے ہوتا تھا۔ اگرچہ اب مرور ایام کی وجہ سے بہت سے مواعظ تلف ہو چکے ہیں۔ کاش کہ کوئی ان مطبوعہ مواعظ کی تہذیب و اصلاح کر کے چند مجلدات کی صورت میں طبع کر دے۔ اس سے جہاں یہ فائدہ ہو گا کہ حضرت تھانویؒ کے مواعظ ضائع نہ ہو سکیں گے۔ وہاں یہ بھی فائدہ ہو گا کہ خریداروں اور پڑھنے والوں کے لیے سہولت ہو گی۔ اور اگر کبھی ریسرچ کا کام شروع ہوا تو تلاش و جستجو زیادہ نہ کرنی پڑے گی۔

تصنیف و تالیف

تصنیف و تالیف میں علامہ جلال الدین سیوطی کا نام مشہور ہے۔ موصوف کی اس قدر تصنیف و تالیف ہیں کہ دوسرے کی ہرگز نہیں ہیں۔ لیکن حضرت تھانویؒ اس سلسلہ میں ان سے بھی آگے بڑھ گئے ہیں۔ آپ کے تمام چھوٹے بڑے رسائل کی تعداد ۴۴۵ ہے

اور مواعظ مطبوعہ کی تعداد ۳۲۱ ہے۔ اس طرح کل مجموعہ کی تعداد ۶۶۶ ہے۔

ان میں حضرت تھانویؒ نے دین کے ہر گوشہ پر لکھا اور اتنا لکھا کہ اب ضرورت لکھنے کی باقی نہ رہی۔ آپ کی معرکۃ الآرا تالیف میں بہشتی زیور اور بیان القرآن ہیں بہشتی زیور کے متعلق تو میں نے اپنے ایک ہم سبق سے سنا ہے جو افریقہ کا رہنے والا تھا۔ کہتا تھا کہ ہمارے یہاں بہشتی زیور کا وہی مرتبہ ہے جو ہندوستان میں صحیح بخاری کا ہے۔

بہشتی زیور اگرچہ شروع میں عورتوں کے لیے تالیف کی گئی تھی۔ مگر اس کی افادیت اور مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ ہر گھر میں موجود ہے۔ اور علماء وغیر علماء سب کو برابر فائدہ پہنچ رہا ہے۔ بہشتی زیور محشیٰ ہو جانے کی وجہ سے علماء کے لیے بھی علمی تحفہ ہو گیا ہے۔ مگر ابھی کافی نظر و تہذیب و ترتیب کی محتاج ہے۔ کاش کہ کوئی اس کام کو انجام دینے کی کوشش کرے۔

ہمارا مشورہ حضرت تھانویؒ کی تالیفات کے بارے میں بھی یہی ہے کہ تمام رسالوں کو مختلف عنوان کے ماتحت ایک کر دیا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت تھانویؒ نے مواعظ و تالیفات کے ذریعہ جتنی دین کی خدمت کی ہے اور قوم کا سدھار کیا ہے کسی دوسرے کو یہ بات حاصل نہیں ہے

پس ان تمام چیزوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے جن لوگوں کو یہ شکایت ہے کہ حضرت تھانوی کے مزاج میں بہت زیادہ سختی تھی، غلط ہے اور لوگ جھک مارتے ہیں جو ایسا کہتے ہیں۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ اگر آپ تعلیم و تربیت اور تصنیف و تالیف کے اس اہم کام کو انجام نہ دیتے تو آج عام مسلمان دین کے صحیح رخ سے واقف نہ

ہوتے۔ رسومات و بدعات و خرافات کو ختم کرکے احیاء سنّت و اجرائے سنت حضرت تھانویؒ کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔

حضرت تھانویؒ نے دین کے ان مسائل و احکامات پر عمل کرکے اور ان کا اجراء فرما کر جن کو آج مذہبی مالیخولیا کا نام دیا جاتا ہے۔ دکھلا دیا اور بتلا دیا کہ انسانوں کے رہنے کے یہ طریقے ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ جو طریقے اختیار کیے جائیں گے وہ طریقے انسانوں کے نہیں بلکہ چوپاؤں کے ہوں گے۔ بلاشبہ حضرت تھانویؒ حکیم الامت تھے۔

وصال

۸۲ سال ۳ ماہ گیارہ دن دنیا کو اپنے وجود مسعود سے متبرک اور منور فرمانے کے بعد آپ کا وصال ۱۶ رجب ۱۳۶۲ ہجری شب سہ شنبہ یعنی ۱۹ ار ۲۰ جولائی ۱۹۴۳ء کی درمیانی شب بعد نماز عشاء ہوا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ تھانہ بھون میں قبرستان عشق بازاں میں مدفون ہوئے "وذوالوصفین" تاریخ وصال ہے

تحریکِ دیوبند اور اصلاحِ امّت

جس تحریک کو اپنے وقت میں کتاب و سنت کے مطابق دینِ اسلام کی بگڑی ہوئی صورت کو نکھارنے کے لیے رسوم و بدعات کو مٹانے کے لیے دنیادار صوفیہ اور اغلاط جہلاء سے تصوّف کو پاک کرنے کے لیے مُردہ سُنّت کو زندہ کرنے کے لیے اکابر دیوبند نے بفحوائے حدیث "لایزال طائفة من امتی منصورین علی الحق لایضرهم من خذلهم" اٹھایا تھا۔ اس کی اشاعت کی سعادت آپ کو حاصل ہوئی۔ اس کو ہندوستان اور بیرونِ ہند میں صحیفوں اور مواعظ کے ذریعے آپ کے قلم و زبان نے پھیلایا اور کس طرح

پھیلایا۔ اس کو مورخ اسلام حضرت مولانا الشاہ سید سلیمان ندوی مرحوم کی زبان سے سنیے۔ "اصلاح اُمّت کی کوشش میں علمی و عملی زندگی کے ہر گوشہ پر ان کی نظر تھی۔ بچّوں سے لے کر بوڑھوں تک۔ عورتوں سے لے کر مردوں تک۔ جاہلوں سے لے کر عالموں تک۔ فاسقوں سے لے کر صوفیوں، درویشوں، زاہدوں تک غریبوں سے لے کر امیروں استادوں اور مدرسوں تک۔ غرض ہر صنف امت اور ہر جماعت کے کاموں تک ان کی نظر دوڑی پیدائش۔ شادی۔ بیاہ۔ غمی اور دوسری تقریبوں اور اجتماعوں تک کے احوال پر ان کی نگاہ پڑی۔ اور شریعت کے معیار پر جانچ کر ہر ایک کا کھرا اور کھوٹا الگ کیا۔ اور رسوم و بدعات اور مفاسد کے ہر روڑے اور پتھر کو صراط مستقیم سے ہٹا دیا۔ تبلیغ، تعلیم، سیاست، معاشرت، معاملات، اخلاق، عبادات اور عقائد میں دین خالص کی نظر میں جہاں کوتاہی نظر آئی اس کی اصلاح کی۔ فقہ کے نئے نئے مسائل اور مسلمانوں کی نئی نئی ضرورتوں کے متعلق اپنے جانے پورا سامان مہیا کر دیا۔ اور خصوصیت کے ساتھ اس فن احسان و سلوک کی جس کا مشہور نام تصوف ہے تجدید کی۔" آگے چند سطروں کے بعد تحریر فرماتے ہیں۔

"ایک پرانے قصبہ کی ایک کہنہ مسجد کے ایک گوشہ میں ایک دوربین زندہ دل مرد درویش بیٹھا ہوا مسلمانوں کے سارے احوال اور ان کی زندگی کے ہر شعبہ پر نظر ڈال کر حق و باطل، نیک اور بد، صحیح و غلط کے درمیان تفرقہ کی لکیر بنانے میں مصروف تھا۔ اس کے سامنے دین صحیح تمثال تھی۔ اور اس کو دیکھ دیکھ کر موجودہ مسلمانوں کی زندگی کی تصویر میں جہاں جہاں غلطیاں تھیں۔ وہ ان کے درست

کرنے میں مشغول تھا۔ اس نے پوری زندگی اس میں صرف کی کہ مسلم کی تصویرِ حیات اس شبیہ کے مطابق بنادے جو دینِ حق کے مرقع میں نظر آتی ہے۔

(جامع المجددین ص۲۷ و ص۲۸)

حسن قبول باوجود عزلت پسندی کے آپ نے ہندوستان کے گوشے گوشے میں سفر کیا۔ اور ہزاروں مواعظ کے ذریعہ کتاب و سنّت کی اشاعت کی جن میں سے تقریباً چار سو پانچ سو مواعظ اسی مجلس میں قلمبند ہو کر طبع ہو گئے اور بار بار طبع ہوتے رہتے ہیں۔ ایسے ہی آپ کے ملفوظات دس پندرہ ضخیم جلدوں میں شائع ہوئے۔ اور آج ایک مخلوق کے لیے درس ہدایت بنے ہوئے ہیں۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے خدام کی ایسی قدردان جماعت عطا فرمائی تھی کہ جنہوں نے آپ کی زبان و قلم سے نکلے ہوئے سبق آموز اور پُر از ہدایت ملفوظات کو قلم بند کر کے شائع کرتے رہنے کا اہتمام رکھا۔ آپ کی ساڑھے چار سو سے زائد تصانیف عربی، فارسی، اردو زبان میں مختلف علوم و فنون میں شائع ہوئیں۔ اور حیات ہی میں درجنوں ایڈیشن شائع ہو گئے۔ جن میں اردو زبان میں بہشتی زیور گیارہ حصّوں میں ایسا مقبول ہوا کہ آبادی اور علاقہ تو کیا معنی شاید ہی کسی مسلمان کا کوئی گھر ان سے خالی رہا ہو۔

آپ کے مرشد نے آپ کو بشارت دی تھی کہ تم کو تفسیر و تصوف سے خاص مناسبت ہوگی۔ چنانچہ آپ کی تفسیر بیان القرآن ضخیم بارہ جلدوں میں نہایت مشہور ہے۔ جس سے آج اساتذہ تفسیر استفادہ کرتے ہیں۔ آپ کا امداد الفتاویٰ ضخیم جلدوں میں تقریباً سولہ سو (۱۶۰۰) صفحات میں شائع ہو چکا ہے جو آجکل

مفتیان عظام کے لیے مشعلِ راہ کا کام دے رہا ہے۔ اور اس میں حوادث الفتاویٰ کا باب آپ کی شان تجدد کا مظہر بنا ہوا ہے۔ اور ترجیح الراجح اخلاص و تدین کا نایاب مرقع ہے جس میں آپ نے اپنے فتاویٰ و تصانیف کی غلطیوں کو خود ذاتی رائے سے محسوس فرما کر یا کسی اہل علم کی اطلاع کے بعد رجوع کیا ہے۔ اور اس رجوع اور آخری محقق رائے کو بلا خوف لومۃ لائم شائع کر کے اسوۂ متقدمین کو زندہ کیا۔ اور آئندہ نسلوں کے لیے غلطی پر جمود اور ہٹ دھرمی کی مذمت اور رجوع الی الحق کا حق و صحیح طریقہ ظاہر کر دیا۔

تصوّف و سلوک میں آپ نے بہت سے مضامین و رسائل شائع کیے۔ جن میں قصد السبیل، تعلیم الدین، آداب المعاشرت التشرف و التکشف، امتیازی شان رکھتے ہیں۔

مریدین و طالبین کی اصلاح و تربیت میں احتساب و مواخذہ فرماتے تھے۔ اور حضرت شیخ اکبر رحمۃ اللہ علیہ کا یہ مقولہ تو بارہا نقل فرماتے "کہ مربی وہ ہے جس کا دین انبیاء کا سا ہو۔ تدبیر اطبا کی سی اور سیاست بادشاہوں کی سی"۔ خوب کہا ہے کہنے والے نے کہ:

ے اے قبائے رہنمائی راست بر بالائے تو
علم و حکمت را شرف از گوہر بالائے تو

نیز بذریعہ خط و کتابت عرض حال اور حصول ہدایت کے طریقے سے ہزاروں میل دور بیٹھ کر مسترشدین کو فیض پہنچاتے رہے۔ ان خطوط سے ہزاروں صفحات کی کتاب جو "تربیت السالک" کے نام سے مشہور ہے ضخیم مجلدات میں تیار ہو گئی۔

اور اس طرح قیامت تک امت کے لیے ہدایت کا سامان ہو گیا۔

تھانہ بھون کے مستقل قیام کے چند روز بعد ہی مرشد کی اجڑی ہوئی خانقاہ (خانقاہ امدادیہ) ذاکرین وشاغلین کا مرکز بن گئی۔ ضروریات زمانہ کے لحاظ سے آپ نے دین کے بعض ابواب کا (جن کی طرف خود دین دار طبقہ کو بھی احساس نہیں رہا تھا یا کماحقہ نہیں تھا) خاص اہتمام فرمایا۔ چنانچہ حقوق العباد کی ادائیگی، اخلاق اور حسن معاشرت کی طرف خاص توجہ فرمائی۔ ان ابواب پر خاص تصانیف بھی فرمائیں۔ اور مجلس میں بھی اس کا اہتمام رکھا۔ عتاب اور مواخذہ کے ذریعہ غافل قلوب کو متوجہ فرمانے کی سعی فرماتے۔ اگر کوئی صاحب اس طریقہ اصلاح کی ندرت کو ظاہر کرتے کہ اور جگہ یہ دار و گیر اور مواخذہ کا طریقہ نہیں ہے۔ تو فرماتے "کہ اوروں کے یہاں برکت ہے اور میرے یہاں حرکت ہے۔ جس کو یہ طریقہ پسند نہ ہو۔ میں بلانے تھوڑا ہی جاتا ہوں۔

ع۔ جس کو ہو جان و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں؟

رسوم و بدعات اور تمام منکرات کو محض علمی طریقہ پر سمجھا دینے کو کافی نہیں سمجھتے تھے بلکہ عملاً پہلے اپنے گھر سے اور اپنی ذات سے ان کو مٹانے کی سعی فرماتے۔ رسوم و منکرات کی مجلس میں شرکت نہیں فرماتے تھے۔ اگر لاعلمی میں عین وقت پر کسی مجلس میں منکرات کا علم ہوا تو بہ لطائف الحیل فوراً علیحدگی اختیار فرما لیتے اور اپنی علیحدگی کی وجہ بھی مناسب عنوان سے ظاہر فرما دیتے تاکہ اور اہل حس بھی ہدایت پا سکیں۔ اس طریقہ پر رسوم موت و شادی کی ناجائز اور غیر ضروری پابندیوں میں فضول خرچی سے برباد ہو جانے والے ہزاروں خاندانوں اور افراد کو تباہی سے بچا لیا۔

آپ کا تصوّف

دربار اشرفیہ میں نہ تو روایتی صوفیوں کی طرح دعوے کیے جاتے تھے نہ مجذوبوں کے سے احکام جاری ہوتے تھے۔ نہ کشف و کرامات کے چرچے سننے میں آتے تھے نہ خوابوں اور کیفیتوں کے تذکرے ہوتے تھے نہ فرائض کی طرح ذکر اور شغل کا اہتمام نظر آتا تھا۔ کیونکہ وہاں ہر وقت اور ہر حال میں کتاب و سنّت کی تعلیم دی جاتی تھی جو دراصل روحِ تصوّف اور جانِ طریقت ہے۔ اسی لیے ایک مرتبہ حضرت تھانویؒ نے فرمایا تھا۔

"یہاں تو مُلّاپن ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ درویشی کیا چیز ہے۔ طالب علم ہیں۔ صاحب علم بھی نہیں۔ بس قرآن و حدیث پر عمل کرنا بتاتے ہیں۔ پھر اس میں جو کچھ کسی کو ملنا ہوتا ہے۔ مل جاتا ہے اور الحمد للہ ایسا ملتا ہے کہ مالا عین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علیٰ قلب بشر۔ مگر ظاہر میں کچھ نہیں نہ ہو حق ہے نہ وجد و حال ہے اور نہ کشف و کرامات۔"

"میرے یہاں ضربیں لگوانے کا دستور نہیں کہ تھوڑی دیر محنت کر لی پھر آزاد پھرتے رہے۔ میرے یہاں تو وہ آدمی ہے جس کو رات دن اپنے نفس پر آرے چلانے ہوں۔ اور قدم قدم پر فکر ہو کہ کون سا کام جائز ہے اور کون سا ناجائز۔"

یہاں تک کہ محض صوفیائے کرام کی طرح آپ کے یہاں توجہ دینے کا بھی قطعاً کوئی التزام نہ تھا۔ بلکہ آپ نے ایک دفعہ اس کی بڑے زور سے تردید فرمائی کہ

"مجھے اپنی ہی فکر سے فرصت نہیں، دوسروں کی طرف متوجہ ہونے کی مجھے کہاں توفیق، میں تو اس توجہ متعارف کو تکلّف ہی سمجھتا ہوں۔ مجھے تو اپنی توجہ ہر طرف سے ہٹا کر ایک خاص شخص کی جانب جو مخلوق ہے ہمہ تن متوجہ ہو جانے میں

غیرت آتی ہے۔ کیونکہ یہ حق تو خاص اللہ ہی کا ہے کہ سب طرف سے توجہ ہٹا کر بس اس ایک ذات واحد کی طرف ہمہ تن متوجہ رہا جائے۔ البتہ دلسوزی اور خیر خواہی کے ساتھ تعلیم کرنا۔ اور دل سے یہ چاہنا کہ طالبین کو نفع پہنچے۔ اور ان کی دینی حالت درست ہو جائے۔ یہ توجہ کا ماثور طریق ہے اور یہی حضرات انبیاء علیہم السلام کی سنّت ہے اور یہ نفع اور برکت میں بھی توجہ متعارف سے کہیں بڑھ کر ہے۔

بایں ہمہ اکثر لوگوں کا گمان بلکہ یقین تھا کہ جو لوگ حضرت سے طریقہ کے ساتھ اپنی اصلاح کے لیے رجوع کرتے ہیں۔ وہ سب کے سب انہیں کے رنگ میں رنگے جاتے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان کی زندگیوں میں انقلاب آجاتا ہے اور اپنے قلوب میں بھی حاضرانہ بلکہ غائبانہ بلکہ کسی ظاہری سبب کے کیفیات خاصہ محسوس کرتے رہتے ہیں یہ سب حضرت کی نظر و توجہ کا ہی نتیجہ ہے۔ چنانچہ اس خیال کے لوگوں کے شبہات کے ازالہ کے لیے آپ نے فرمایا کہ "یہ شبہ نہ کیا جائے کہ بغیر قصد توجہ کیے ہوتے اثر کیسے ہوتا ہے۔ بات یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے محض قلوب ہی کے اندر تعدیہ کی صفت رکھی ہے جیسے کہ گو آفتاب کا یہ قصد نہیں ہوتا کہ اس کا نور دوسروں کو پہنچے لیکن پھر بھی اس کا نور دوسروں کو پہنچتا ہی رہتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر یہ صفت رکھ دی ہے کہ جو شے اس کے مقابل میں آجاتی ہے وہ منور ہو جاتی ہے"

مخالفین کے ساتھ معاملہ

مخالفین سے ایسے نرم و مہذّب اور متین سلوک کی مثال شاید تاریخ مشاہیر پیش نہ کر سکے۔ مخالفین سے ایسا نرم سلوک کرنے کے ساتھ ساتھ آپ ان لوگوں کے جذبات کا بھی بڑا احترام کرتے تھے۔ چنانچہ ایک اور موقع پر آپ نے ایک ایسی

شکایت کے جواب میں لکھا ہے کہ :-

"میں اپنے مخالفین اور موذیوں (ایذا دینے والوں) کے جذبات کی بھی رعایت کرتا ہوں کہ ان پر نیک نیتی کا بھی احتمال رکھتا ہوں۔ اور صبر تو ہر حال میں کرتا ہوں مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی کے جواب میں کبھی ایک سطر بھی نہیں لکھی۔ کافر، خبیث، ملعون سب کچھ بنتا رہتا ہوں۔ ابھی ابھی ایک عنایت فرما کا خط آیا تھا اس میں مجھ کو گدھا تک لکھا ہوا ہے۔ مگر ان مراقبات کو اپنا امام بناتا ہوں۔ اپنی زبان قلم یا قلب کو ملوث کیا۔ میرا کیا بگڑا۔ رہا رنج وہ کوئی بگاڑ نہیں محض خیال کے تابع ہے۔ ممکن ہے اس شخص کی نیت اچھی ہو۔ مثلاً امر بالمعروف نہی عن المنکر اس لیے وہ معذور ہو۔ گو ہم بھی اس لیے معذور ہوں کہ ہم اپنے کو حق پر سمجھتے ہوں، یا اپنی غلطی بھی نظر میں ہو مگر اصلاح کا طریق ہمارے نزدیک اس سے سہل اور اسلم ہو۔ اگر اس نے ہم کو ناحق بھی رنج دیا تو اپنی عاقبت خراب کی ہم کو صبر کا ثواب ملا۔ نیز ایسے واقعات سے بھی بعض اوقات اپنی کوتاہیوں پر نظر ہو کر اصلاح کی توفیق ہو جاتی ہے اگر یہ بھی نہ ہو تو کم از کم معتقدین کی عنایت سے جو عجب و کبر پیدا ہو گیا تھا یا ہو سکتا تھا اس کا ازالہ یا انسداد ہو جاتا ہے نیز خود بھی ایسے مخاطبات اپنے سے سرزد ہو جاتے ہیں۔ اپنی ناگواری سے ان کی ناگواری سامنے آجاتی ہے۔ اور ایسے مخاطبات سے اجتناب کی توفیق ہو جاتی ہے۔

اعتراف مخالفین

حضرت کا چونکہ ہر قول و فعل مطابق کتاب و سنت ہوتا تھا۔ اس لیے اس اتباع کامل کی برکت سے دیکھنے والوں پر بھی گہرا اثر پڑتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے مخالفین کو بھی اس بات

کا اعتراف تھا کہ نہ صرف حضرت تھانویؒ بلکہ ان کے منتسبین بھی صحیح المعاملہ ہیں۔

ایک مرتبہ ایک غیر مقلّد صاحب کسی کام کے سلسلہ میں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے واپس جا کر انہوں نے اپنے مشاہدہ کی بنا پر اپنے ایک ملنے والے سے کہا۔

"ہم لوگوں میں تو اتباع سنّت کا فقط دعویٰ ہی دعویٰ ہے۔ اتباع سنّت تو ہم نے وہاں دیکھا۔ ایک کتاب کی ضرورت ہوئی تو خود اٹھ کر کتب خانہ سے لائے کسی سے نہیں کہا کہ لے آؤ۔ اپنا کام خود کیا کہ دوسرے کو تکلیف نہ ہو۔ سبحان اللہ کیا اتباع سنّت ہے۔ اور کتنی تواضع ہے کہ بلا تکلف خود اُٹھ کر لے آتے۔

آپ کی خدمات کا اعتراف

اس سلسلہ میں آپ کی وفات پر ایک علمی مجلّہ کے تاثرات ملاحظہ ہوں۔

"یوں تو موت اس عالم آب و گل کی ہر اس چیز کے لیے مقدر ہے جو زندگی کا عاریتی لباس پہن کر بساطِ ہستی پر نمودار ہوئی ہے۔ لیکن جس طرح زندگی زندگی میں فرق ہوتا ہے۔ اسی طرح ہر ایک کی موت بھی یکساں نہیں ہوتی۔ کبھی کبھی ایسی اموات بھی واقع ہوتی ہیں۔ جو صرف افراد و اشخاص کی اموات نہیں ہوتیں۔ بلکہ ان ہزاروں لاکھوں کی عمارت حیات بھی اس سے متزلزل ہو جاتی ہے جو مرنے والے کے دامانِ عقیدت و ارادت سے وابستہ ہوتے ہیں۔ پھر اس کی موت کا ماتم آنکھوں کے چند قطرہائے اشک سے نہیں ہوتا۔ بلکہ ہزاروں دلوں کی پُرسکون آبادیاں ایک مستقل غمکدۂ آمال و امانی بن کر رہ جاتی ہیں۔ امیدوں اور ولولوں کے چراغ بجھ

جاتے ہیں۔ نشاط و کامرانی حیات کے آتشکدے سرد ہو جاتے ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس حادثہ جانکاہ نے کائنات عالم کی ہر چیز کو اداس اور غمگین بنا دیا ہے۔ اسی قسم کی ایک موت پر عربی شاعر نے کہا تھا:

وَمَا كَانَ قَيْسٌ هُلْكُهُ هُلْكَ وَاحِدٍ
وَلٰكِنَّهُ بُنْيَانُ قَوْمٍ تَهَدَّمَا

(قیس کا مرنا صرف ایک شخص کا مرنا نہیں ہے بلکہ وہ ایک قوم کی بنیاد تھا جو منہدم ہو گئی۔)

گزشتہ ماہ جولائی ۱۹۴۳ء کی تاریخ ۱۹ر-۲۰ر کی درمیانی شب کو تقریباً دس بجے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا جو سانحہ ارتحال پیش آیا وہ اسی قسم کا سانحہ تھا۔ حضرت مولانا جس طرح شریعت کے عالم متبحر تھے۔ طریقت و سلوک میں بھی مقام رفیع کے مالک تھے۔ اُن کی ذات علوم ظاہری و باطنی کا مخزن تھی۔ علم سفینہ سے زیادہ علم سینہ ان کا اصلی جوہر اور زیور تھا۔ تحریریں علم و فضل کا معدن ہوتی تھیں۔ اور تقریر بھی بلا کی اثر انگیز تھی۔ وہ جس بات کو حق سمجھتے تھے اسے برملا کہتے تھے اور کرتے تھے۔ اور اس میں انہیں کسی لومۃ لائم کی پرواہ نہیں ہوتی تھی۔ خود ایک درویش گوشہ نشین تھے۔ مگر ان کا "آستانہ" بڑے بڑے ارباب ثروت و دولت اور اصحاب علم و فضل کی عقیدت گاہ تھا جو بات اور جو عمل تھا اخلاص و دیانت کے ساتھ تھا۔ دنیاوی وجاہت اور شہرت مالی حرص و آرزو کا شائبہ دل کے آس پاس بھی گزر نہ ہوا۔ اپنے اصول اور عقیدہ و خیال پر اس مضبوطی اور پختگی سے عمل پیرا ہوتے تھے کہ دنیا کی کوئی طاقت ان کو اس سے منحرف نہیں کر سکتی تھی۔

حضرت مرحوم کا آستانہ معرفت و روحانیت کا ایک ایسا چشمہ صافی تھا کہ ہزاروں تشنہ کام آتے اور سیراب ہوکر جاتے تھے۔ وہ جن کی زندگیاں معصیت کوشی اور عصیان آلودگی میں بسر ہوئی تھیں۔ یہاں سے پاک وصاف ہوکر اور گوہر مقصود سے دامن آرزو کو بھر کر واپس لوٹتے تھے۔ ان کی زندگی اتباع کا ایک زندہ درس اور ان کی گفتگو اسرار و رموز طریقت کا دفتر گرانمایہ تھی۔ بعض مسائل میں علماء ہند کی ایک جماعت کو ان سے ہمیشہ اختلاف رہا، لیکن تقویٰ و طہارت۔ تفقہ فی الدین، علوم شرعی میں مہارت و بصیرت، راست گفتاری اور مخلصانہ عمل کوشی، انابت الی اللہ، بے لوث خدمت دین، بے غرضانہ تلقین رشد و ہدایت۔ حضرت مرحوم کے یہ وہ اوصاف عالیہ اور فضائل حمیدہ تھے۔ جو ہر موافق و مخالف کے نزدیک برابر مسلّم رہے۔ بعض عوارض و اسقام کی بنا پر گوشہ نشین ہونے سے قبل اپنے مواعظ حسنہ اور اپنی کثیر تصانیف کے ذریعہ حضرت مرحوم نے اصلاح عقائد و اعمال اور ابطال رسوم و بدعات کی جو عظیم الشان خدمت انجام دی ہے۔ وہ غالباً تمام ہم عصروں میں ان کا واحد طغرائے امتیاز ہے۔ قوم نے اُن کو "حکیم الامت" کا خطاب دیا تھا۔ اور بالکل بجا دیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت مرحوم نے اپنی تحریروں اور تقریروں سے ہزاروں انسانوں کے روحانی امراض کا ایسا کامیاب علاج کیا جو خزف ریزے تھے وہ گوہر آبدار بن گئے۔ اور جو صرف پیتل تھے وہ زر خالص ہو گئے۔

چھوٹے بڑے رسالے اور مستقل تصانیف جو مولانا کے قلم سے شائع ہوئیں ان سب کی مجموعی تعداد تو تازہ ترین شمار کے مطابق آٹھ سے اوپر بیان کی جاتی ہیں۔

جن میں سے کثیر تصانیف ملک میں اتنی مقبول ہوئیں کہ اب تک ان کے درجنوں ایڈیشن طبع ہو چکے ہیں۔ کہا جاتا ہے اور غالباً اس میں مبالغہ نہیں ہے۔ کہ مولانا کی تصانیف جو اب تک طبع ہو چکی ہیں۔ ان کی مجموعی قیمت چالیس لاکھ روپے سے کم نہیں ہے۔ مولانا کی سیر چشمی اور فیاضی اور للّٰہیت کی دلیل اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے۔ کہ تصنیفات کی اس غیر معمولی مقبولیت کے باوجود آپ نے کسی کتاب کا حق اشاعت و طبع اپنے لیے محفوظ نہیں رکھا۔ ہر شخص کو ان کے چھاپنے اور طبع کرانے کا اذنِ عام تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مادی دنیا میں مولانا کا صرف یہ ایک عمل ہی ایسا ہے۔ جو آج کل کے بڑے بڑے نامور علماء کے لیے سرمایۂ عبرت اور درسِ عبرت و عظمت ہو سکتا ہے۔ پھر یہ تصانیف کسی خاص طبقہ کے لیے مخصوص نہیں۔ علماء اور فضلاء، اربابِ شریعت اور اصحاب ظاہر و باطن، مرد و عورت، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور معمولی اُردو خواں، ہر ایک ان سے استفادہ کر سکتا ہے اور اپنے لیے اصلاحِ ظاہر و باطن کا سامان بنا سکتا ہے۔ مولانا کی تحریروں میں اسرار و نکات کے علاوہ ایسا عجیب منطقی اور عقلی استدلال ہوتا ہے کہ بڑے سے بڑا حریف بھی تصدیق و تائید سے کوئی مفر نہیں دیکھتا۔ جس بات کو بیان کرتے نہایت وثوق اور یقین کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ حضرت مرحوم کی تحریریں اور ان کی گفتگو غیر معمولی ذکاوت و متانت کی آئینہ دار ہوتی تھیں۔ بات سے بات پیدا کرنا اور ہر طرح کے معاملہ کی اصل حقیقت کو پہچاننا ان کی ذہانت کا خاص جوہر تھا۔

خواص کے لیے تفسیر بیان القرآن اور شرح مثنوی مولانا رومؒ اور عورتوں کے لیے بہشتی زیور آپ کی ایسی گراں بہا اور کثیر الشیوع تصانیف ہیں۔ کہ جو اپنی

مخصوص نوعیت سے اردو کے مذہبی لٹریچر میں اپنا جواب نہیں رکھتیں اور مؤخرالذکر کتاب تو اس قدر مقبول ہوئی ہے کہ ہندوستان کا شاید ہی کوئی اردو خواندہ ہوگا۔ جس نے کم از کم اس کا نام نہ سنا ہو۔

استغناء اور توکل

اللہ تعالیٰ نے آپ کو علم وفضل اور کمالات باطنی کے ساتھ استغناء اور توکل کی نہایت ممتاز اور یگانۂ روزگار دولت عطا فرمائی تھی۔ آپ کا استغناء تنہا آپ کی ذات تک محدود نہ تھا۔ بلکہ آپ مستغنی گر تھے کہ تمام اہلِ علم اور دینداروں کو مستغنی دیکھنا چاہتے ہیں۔ مستغنی بنانا چاہتے تھے۔ آپ کی خانقاہ اصلاحِ اعمال واخلاق اور تربیتِ باطن کی درس گاہ تھی وہاں طالبانِ حق اپنے امراض باطنی، کبر ونخوت، غرور، غصہ، وساوس وغیرہ لے کر آتے تھے اور علاج کے لیے پیش ہوتے تھے۔ اور یہاں سے مناسب نسخے تجویز کیے جاتے تھے۔ اور شفایاب ہوتے تھے۔ حکیم الامتؒ نے ضرورت سمجھ کر اپنی خانقاہ میں مسئلہ مسائل اور ابتدائی معلومات کے لیے "امداد العلوم" کے نام سے ایک مدرسہ بھی قائم کیا تھا جس میں نہایت مختصر نصاب "ضمان التکمیل فی زمان القلیل" کے نام سے جاری کیا تاکہ ذاکرین ظاہری علم سے بھی کماحقہ واقفیت حاصل کرسکیں۔

اس مدرسہ کا مدار بھی توکل پر رکھا۔ جو بحمد للہ اب تک حسب وصیت اسی اصل کے ماتحت جاری ہے۔ اس کے مدرسین اور ملازمین کی تنخواہ تو مقرر کر دی جاتی ہے لیکن تنخواہ کی ادائیگی کی ذمہ داری نہیں لی جاتی۔ تقرر کے وقت ہی کہہ دیا جاتا ہے کہ گنجائش ہوگی تو دی جائے گی۔ گنجائش نہ ہوگی عذر کر دیا جائے گا۔ اسی لیے قبض الوصول ہی نہیں ہے۔ چندہ کی تحریک کی ہمیشہ کے لیے ممانعت ہے۔ البتہ بلا تحریک جائز

رقم یہاں کے اصول کے مطابق آجائے تو قبول کی اجازت ہے لیکن رسید نہیں دی جاتی۔ جس کو اعتماد ہو چندہ دے، اعتماد نہ ہو نہ دے۔ خرچ کو آمدنی کے اندر رکھنے کی وصیت ہے۔ آمدنی کم ہو جائے تو خرچ بھی کم کر دیا جاتا ہے۔ اسی لیے کبھی اس کی نوبت نہیں آئی، کہ تنخواہ صحیح وقت پر یکم تاریخ کو ادا نہ ہو گئی ہو۔

اس استغنار اور توکل ہی کی برکت تھی کہ بڑے بڑے اہل جاہ و ثروت مدمغ اور فلسفی، نو تعلیم یافتہ سائنسدانی کے دعویداروں کو جب آپ سے گفتگو یا مکاتبت کا واسطہ پڑتا تو چند ہی منٹ کی گفتگو یا دو ایک ہی مکاتبت میں ان کو اپنا پندار اپنا علم اپنی جاہ و ثروت، اپنی سائنسدانی محض غرور اور دھوکہ کی پوٹ محسوس ہونے لگتا تھا۔ اور اس کے مقابلے میں اللہ والوں اور رسولؐ کے نائب کا صحیح مقام پیش نظر ہو جاتا تھا جیسا کہ آپ کو ذیل کے دو[۲] واقعات سے معلوم ہوگا۔

حضرت تھانویؒ یہ برداشت نہ کرتے تھے کہ کوئی علمائے حق کو گری ہوئی نظر سے دیکھے۔ اگر کسی سے ایسی غلطی ہو جاتی تو ایسا سبق پڑھاتے کہ وہ عمر بھر نہ بھولتا۔

ایک کانفرنس کے سلسلہ میں آپ کو ڈھاکہ مدعو کیا گیا۔ آپ نے شرح صدر نہ ہونے کی وجہ سے عذر فرما دیا۔ لیکن نواب صاحب ڈھاکہ اور علماء دیوبند کے اصرار پر آپ نے کچھ شرطوں کے ساتھ منظور فرما لیا۔ ایک مرتبہ اس سے پہلے بھی نواب صاحب کی دعوت پر آپ تشریف لے جا چکے تھے۔

اصرار پر آپ نے سفر کا ارادہ تو کر لیا۔ لیکن فراست سے آپ محسوس فرما رہے تھے کہ سفر کا پورا ہونا مشکل ہے۔ اس لیے آپ نے وہ سفر اپنے ذاتی خرچ سے کیا۔ کلکتہ پہنچے تو نواب صاحب نے اپنے ایک عزیز کے ذریعہ ہاں

طعام وقیام کا شایانِ شان انتظام کیا۔ اور حضرت والا سے ملاقات کی۔ باتوں باتوں میں نواب صاحب کے عزیز جو خود بھی بہت بڑے رئیس تھے، حضرت سے کہنے لگے کہ آپ کے انکار کے بعد آپ کی تشریف آوری سے نواب صاحب کو بڑی مسرّت ہوئی ہے۔ فرماتے تھے کہ آپ کی شرطیں بڑی سخت ہیں۔ جن کو قبول نہیں کرسکتے۔ جیسے ایک تو یہی شرط کہ کوئی ہدیہ پیش نہ کیا جائے۔

حضرت نے فرمایا۔ نہ دینے کی شرط کیا مشکل ہے۔ دینا تو دشوار ہوسکتا ہے نہ دینا کیا مشکل ہے۔

رئیس نے عرض کیا۔ صاحب! جس سے محبت ہوتی ہے اس کو تو یہ ہدیہ دینے کے لیے جی چاہتا ہے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اپنے محبوب کی خدمت نہ کی جائے۔

حضرت نے جواب دیا "یہ ضروری ہے کہ محبوب کو اپنے گھر ہی بلا کر ہدیہ دیا جائے اگر ایسا ہی شوق ہے تو اس کے گھر جا کر یا بھیج کر بھی تو ہدیہ دیا جاسکتا ہے۔

رئیس ہونا اور بات ہے اور سلیقہ سے گفتگو کرنا اور بات ہے۔ اس منتظم کو بات کرنا نہ آئی۔ اور نخوت سے کہا، جناب معاف فرمائیے۔ پیاسا کنوئیں کے پاس آتا ہے کنواں پیاسے کے پاس نہیں جاتا۔

نخوت کا علاج

حضرت تھانوی کو یہ کلمات سن کر بہت رنج ہوا مگر آپ نے ناگواری کو ظاہر نہیں کیا۔ اور نہایت تہذیب سے اس رئیس کو مخاطب کیا کہ :۔

"آپ کا خیال یہ ہے کہ آپ حضرات کنواں ہیں اور ہم پیاسے۔ اور ہمارے دماغ میں یہ سمایا ہوا ہے کہ ہم لوگ کنواں ہیں اور آپ پیاسے' اور اس کی ہمارے پاس

دلیل بھی ہے۔ اس لیے کہ ضرورت کی دو چیزیں ہیں۔ دین اور دنیا۔ ان میں سے ہماری حاجت کی ایک چیز تو آپ کے پاس ہے (یعنی دنیا) اور آپ کی حاجت کی ایک چیز ہمارے پاس ہے (یعنی دین) فرق اتنا ہے کہ ہماری حاجت کی جو چیز آپ کے پاس ہے یعنی دنیا وہ اللہ تعالیٰ نے بقدر ضرورت ہمیں بھی دے رکھی ہے لیکن آپ کی حاجت کی جو چیز ہمارے پاس ہے یعنی دین وہ آپ کے پاس بقدر ضرورت بھی نہیں۔ آپ ہمارے محتاج ہوئے یا ہم آپ کے، آپ پیاسے اور ہم کنواں ہوتے یا ہم پیاسے اور آپ کنواں ہوتے۔ وہ رئیس شرمندہ ہو کر بغلیں جھانکنے لگے حضرت والا نے وہیں سے قطع سفر کا ارادہ کر لیا۔ اور واپس تشریف لے آئے۔

(۲) آپ حیدرآباد اپنے ایک اہل دوست کی فرمائش پر تشریف لے گئے۔ سات ہی روز گزرے تھے کہ ایک نواب صفدر یار جنگ کا پرچہ آیا جو نواب صاحب حیدرآباد کی ناک کا بال اور ارکان سلطنت میں سے تھے۔ لکھا تھا کہ "عرصہ سے مجھ کو زیارت کا اشتیاق تھا مگر بدقسمتی سے تھانہ بھون کی حاضری نصیب نہیں ہوئی۔ برائے زیارت حاضر ہونا چاہتا ہوں۔ فلاں فلاں وقت اپنے فرائض منصبی سے فرصت ملتی ہے۔"

آپ نے جواب لکھا "بے حد مسرت ہوئی کہ آپ کے دل میں دین اور اہل دین کی محبت و عظمت ہے۔ مگر نیچے کی سطر پڑھ کر افسوس کی بھی کوئی حد نہ رہی۔ کہ اس میں فہم سے کام نہ لیا گیا۔ جس کے ملنے کو زیارت سے تعبیر کیا گیا۔ اس کو تو اپنے اوقات فرصت بتلا کر پابند کیا گیا اور خود آزاد رہے۔ یہ کونسی فہم و تہذیب کی بات ہے۔"

اس پر نواب صاحب نے اپنی کج فہمی کی معافی چاہی اور لکھا کہ حضرت والا

ہی اپنی ملاقات کے اوقات تحریر فرمائیں۔ اس پر حضرت نے ان کو ایک اور سبق دیا۔ کہ اب بھی پورے فہم سے کام نہیں لیا گیا۔ مُردہ بدست زندہ کی طرح مہمان بان کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ اس لیے سفر میں اوقات کا ضبط ہونا غیر اختیاری ہے۔ آپ ساتھ رہیں جس وقت مجھ کو فارغ دیکھیں ملاقات کر لیں۔

اس پر انہوں نے لکھا بدفہمی پر بدفہمی ہوتی چلی جا رہی ہے۔ میں اب اپنے اوقات کو ظاہر کرتا ہوں نہ حضرت سے معلوم کرتا ہوں جس وقت فرصت ہوگی حاضر خدمت ہو کر زیارت سے مشرف ہو جاؤں گا۔ اگر فرصت نہ ہوئی تو لوٹ آؤں گا۔ جب حضرت نے دیکھا کہ اصلاح پذیر ہو گئے ہیں تو دلجوئی کے طور پر لکھا۔ اب پورے فہم سے کام لیا گیا ہے۔ جس سے اس قدر مسرّت ہوئی کہ پہلے آپ کا میری زیارت کو جی چاہ رہا تھا۔ اب میرا آپ کی زیارت کو جی چاہنے لگا۔ اگر فرصت ہو تو آپ تشریف لے آیئے۔ ورنہ مجھ کو اجازت فرمایئے خود حاضر ہو جاؤں۔ غرض کہ وہ خود آ گئے۔

آپ نے فرمایا کہ میرا یہ طرزِ عمل اس لیے تھا کہ یہ دنیا کے جس قدر بڑے لوگ ہیں۔ اہلِ دین کو بیوقوف سمجھتے ہیں۔ ان کو یہ دکھلانا تھا کہ اہلِ علم کی یہ شان ہے کہ پہلے تو تذلل سے بچنا مقصود تھا مگر جب وہ اپنی کوتاہی تسلیم کر چکے تو اب کھنچنا تکبّر تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے محفوظ رکھا۔ ملاقات کے دوران میں وہ نواب صاحب حیدر آباد کی بیدار مغزی اور انتظام سلطنت کے واقعات بیان کرتے رہے۔ اس کے بعد کہا۔ کہ اگر نواب صاحب سے ملاقات ہو جائے تو بہت مناسب ہے۔ آپ نے پوچھا یہ آپ کی خواہش ہے یا نواب صاحب کی۔ کچھ سکوت کے

بعد کہا کہ میری خواہش ہے۔ آپ نے سوال کیا کہ جس وقت آپ نے مناسب یا غیر مناسب ہونے پر غور فرمایا ہوگا۔ اس پر بھی غور فرمایا ہوگا کہ ملاقات سے نفع کس کا ہے؟ کہا نواب صاحب کا۔ میں نے کہا کہ نفع نواب صاحب کا اور ملاقات کی ترغیب مجھ کو دی جارہی ہے۔ مطلوب کو طالب اور طالب کو مطلوب بنایا جارہا ہے۔ اس پر کوئی جواب نہ دیا۔ آپ نے فرمایا کہ اب میں خود عرض کرتا ہوں کہ اس صورت میں کہ میں خود ملاقات کو جاؤں مضرت ہی مضرت ہے نفع کچھ نہیں۔ اگر میں ملاقات کو گیا تو وہ مطلوب اور میں طالب ہوں گا۔ اس صورت میں ان کو مجھ سے کچھ نفع نہ ہو گا۔ ہاں ان سے مجھ کو نفع ہوسکتا ہے۔ اس لیے کہ ان کے پاس جو چیز ہے وہ مجھے ملے گی یعنی دنیا، وہ بقدر ضرورت بحمد للہ میرے پاس بھی ہے۔ اور جو میرے پاس ہے وہ بقدر ضرورت بھی ان کے پاس نہیں یعنی دین، اور اگر میں گیا بھی اور جو اُن کے پاس ہے (یعنی دنیا، منصب۔ وظیفہ وغیرہ) وہ مل بھی گیا تو اس صورت میں ایک خاص ضرر بھی ہے۔ اگر قبول کرتا ہوں تو اپنے مسلک کے خلاف، اگر قبول نہیں کرتا تو آداب شاہی کے خلاف، کیونکہ قبول نہ کرنے میں اُن کی سُبکی اور اہانت ہوگی۔ اور چونکہ میں اس وقت ان کے حدود میں ہوں۔ اس کی پاداش میں اخراج وغیرہ جو چاہیں میرے لیے تجویز کر سکتے ہیں۔ تو نواب صاحب کو کوئی نفع نہ ہوگا اور میرا نقصان ہوگا۔

تذکرہ دیوبند
